The Journal of Arts, Sociology and Humanities
JASH, Vol. 4 No. 1 (2026). Homepage: https://thejash.org.pk/index.php/jash

انور سدید کے خاکوں میں بین المتونیت کے عناصر: تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

سندس ہاشمی
گورنمنٹ ایسوسی ایٹ کالج برائے خواتین کھوٹہ۔ ای میل: sundashashmi777@gmail.com

Abstract

This article critically examines the elements of intertextuality in the sketches of Anwar Sadeed. It begins with an overview of Urdu sketch writing and its tradition to provide literary and artistic context. The study employs the theoretical framework of intertextuality as conceptualized by Julia Kristeva, outlining its key features. The analysis highlights literary, historical, and socio-political intertextuality in Anwar Sadeed's sketches, demonstrating how references are organically embedded rather than treated as isolated sections. The findings show that his sketches transcend mere biographical or narrative description, engaging with broader literary traditions, historical consciousness, and socio-political realities. The study concludes that intertextuality is a central, dynamic element in Sadeed's writing, enriching it with intellectual depth and critical insight.

کلیدی الفاظ: بین المتونیت، اردو خاکہ نگاری، ادبی تجزیہ، تاریخی شعور، سماجی و سیاسی تناظر، انور سدید، ادبی اشارات

خاکہ نگاری کا تعارف و روایت:

اُردو ادب کی شعری و نثری اصناف میں ادبا ءنے سماج کے اتار چڑھاؤ، عروج و زوال اور تہذیبی و ثقافتی اقدار کو قاری تک پہنچانے کا فریضہ سرانجام دیا ہے ۔ شاعری ہو یا نثر ہر دو اصناف میں ادباء نے اپنے اسلوب کی انفرادیت اور اثر آفرینی سے ادب کے دامن کو وسعت عطا کی ہے۔ اردو ادب کی نثری اصناف میں خاکہ نگاری بھی اسی روایت کا تسلسل ہے۔ جیسے ادب سماج کی اچھائیوں اور برائیوں کا منظرنامہ پیش کرتا ہے اسی طرح خاکہ بھی شخصیت کی عکاسی کرتا ہےنیز کسی فرد کی خصوصیات، خوبیوں ، خامیوں اور افکار کو تحریری صورت میں لاتا ہے۔ خاکہ کے لغوی معانی ڈھانچہ بنانا، لکیر کھینچ کر نقشہ بنانا یا تصویر بنانا کے ہیں۔سید محمد حسنین نے خاکہ کی تعریف یوں بیان کی ہے:

نوک قلم کی تصویر کشی خاکہ نگاری ہے۔جسے قلمی تصویر یا مرقعے سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔خاکہ ایسی تصویر ہے جو کسی بت تراش،مصور یا فوٹو گرافرکا عمل نہیں۔ اس تصویر کا خالق قلم کار ہوتا ہے۔ خاکہ کسی شخص یا مردِ واحد کی گم سم تصویر نہیں ،یہ ہنستی بولتی تصویر ہے جو ہمارےاحساسات کو انگیخت کرنے کی قوت رکھتی ہے۔۱

خاکہ نگاری کی تخلیقی تشکیل عموماً تین بنیادی مراحل سے گزرتی ہے۔ پہلا مرحلہ شخصیت کے انتخاب کا ہے جہاں محض قربت یا شہرت نہیں بلکہ فکری، نفسیاتی اور تہذیبی گہرائی کو پیشِ نظر رکھا جاتا ہے۔ دوسرا مرحلہ حقیقت پسندی سے وابستہ ہےجس میں مبالغہ آرائی سے گریز اور دیانت دارانہ اظہار بنیادی شرط ہے۔ تیسرا مرحلہ غیر جانب داری اور توازن کا ہےجہاں ذاتی رجحانات سے فاصلے کے ساتھ ایک ہمدردانہ زاویۂ نظر بھی ملحوظ رکھا جاتا ہےکیونکہ انسانی شخصیت نہ سراسر

معصوم ہوتی ہے اور نہ مکمل طور پر عیب سے خالی ہوتی ہے۔ بشیر سیفی کی کتاب خاکہ نگاری: فن و تنقید میں خاکہ نگاری کے فن اور اس کے سفر کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔آپ لکھتے ہیں :

اچھے خاکے کی ایک خوبی یہ بھی بتائی گئی ہے کہ اس میں شخصیت کے روشن و تاریک دونوں پہلوؤں کی جھلک دکھائی جائے ورنہ پیش کردہ قلمی تصویر یک رخی قرار پائے گی کیونکہ انسان نہ اچھائیوں کا مرقع ہے نہ برائیوں کا۔ ہر انسان میں خوبیوں کے ساتھ خامیاں اور خامیوں کے ساتھ خوبیاں بھی ہوتی ہیں۔۲

خاکہ نگاری کا ایک بنیادی وصف اختصار ہے کیونکہ خاکہ جتنا مختصر، جامع اور بامعنی ہو گا اتنا ہی زیادہ مؤثر ثابت ہو گا۔ اس صنف میں کردار نگاری کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ تاہم اس کا مقصد کسی ادیب یا شاعر کے علمی و فنی کمالات کا پرچار یا اس کے مرتبے کا تعین نہیں بلکہ اس کے اندر موجود انسان کو پیش کرنا ہے۔ اس عمل میں واقعہ نگاری اہم کردار ادا کرتی ہےکیونکہ شخصیت سے وابستہ واقعات اور چھوٹی کہانیاں اس کی سیرت کو معنی عطا کرتی ہیں۔ جب کہ حلیہ نگاری ظاہری خدوخال کے ذریعے شخصیت کو واضح کرتی ہےاگرچہ بعض خاکہ نگار باطنی اوصاف اور نفسیاتی جہات کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ ان عناصر کے ساتھ وحدتِ تاثر خاکے کا لازمی جزو ہے جو اس تحریر کو منتشر ہونے سے بچاتی ہے۔ اسی طرح خاکے کا اسلوب عموماً شگفتہ اور دلکش ہوتا ہےکیونکہ ضرورت سے زیادہ سنجیدگی اور خشکی اسے محض معلوماتی مضمون یا سوانحی نوٹ بنا دیتی ہے۔ تاہم یہ تمام خوبیاں اسی وقت مؤثر ثابت ہوتی ہیں جب خاکہ نگار کو زبان و بیان پر مکمل عبور حاصل ہوجو خاکے کو معلومات کے بیان سے نکال کر ایک زندہ، مربوط اور یادگار ادبی تجربہ بنا دیتا ہے۔

خاکہ نگاری کی روایت:

صنفِ خاکہ نگاری اردو ادب میں زیادہ قدیم نہیں تاہم اس کے ابتدائی نقوش قدیم فارسی اور اردو تذکروں میں ملتے ہیں۔ ان تذکروں میں شعرا کے شخصی اوصاف، حلیے اور مختصر حالات ضرور بیان کیے گئےمگر توجہ زیادہ تر کلام پر مرکوز رہی اس لیے انہیں مکمل معنوں میں خاکہ نگاری کے اولین نمونے قرار نہیں دیا جا سکتا۔ میر تقی میر کا نکاتُ الشعراء اس روایت کی ایک اہم مثال ہےجہاں شخصی تعارف تو موجود ہے مگر شخصیت کی داخلی اور فکری جہات پوری طرح سامنے نہیں آتی ہیں ۔ اسی طرح انشا اللہ خاں انشا کے دریائے لطافت میں حلیہ نگاری کا عنصر نمایاں ہےجو خاکہ نگاری کی طرف ایک ابتدائی قدم تو ہے مگر اسے باضابطہ خاکہ نہیں کہا جا سکتااس زمانے میں لکھے گئے تذکروں میں شاعر کے متعلق زیادہ تفصیل بیان کی گئی ہے مگر اس کے باجود ایک کمی موجود تھی۔ مولانا حسین آزاد کی آبِ حیات اُردو ادب میں نمایاں مقام رکھتی ہے اور تذکرے کی روایت میں اہم ہے۔ ان کے قلمی نسخے خاکہ نگاری کے قریب قریب معلوم ہوتے ہیں۔ان سے پہلے موجود تذکروں میں فقط حُلیہ نگاری پر ہی زور دیا جاتا تھا۔ آزاد نے آبِ حیات میں پہلی بار شخصیت کے کہ شخصیت کلی طور پر ہمارے سامنے آ عادات و اطوار ،خوبیوں اور کمزوریوں کو ایسے پیش کیا جاتی ہے۔ آپ خود آبِ حیات کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

جو حالات ان بزرگوں کے معلوم ہیں یا مختلف تذکروں میں متفرق مذکورہ ہیں انھیں جمع کر کے ایک جگہ لکھوں اور جہاں تک ممکن ہو اس طرح لکھوں کہ ان کی زندگی کی بولتی چالتی، پھرتی چلتی تصویریں سامنے آن کھڑی ہوں اور انھیں حیات جاوداں حاصل ہو۔۳

اس کے بعد عبد الحلیم شرر، مرزا ہادی رسوا اور خواجہ حسن نظامی اس سلسلے کی اہم کڑیاں ہیں جنھوں نے اس صنف کو آگے بڑھایا جس کی عمارت آزاد نے کھڑی کی تھی۔بیسیویں صدی کی تیسری دہائی میں ایک شخصی مضمون نذیر احمد کی کہانی منظر عام پر آیا جسے اُردو ادب میں اولین خاکہ کی حیثیت کے طور پر مانا جاتا ہے۔مرزا فرحت اللہ بیگ کے اس تخلیقی کارنامے کے بنا پر آپ کو باضابطہ طور پر پہلا خاکہ نگار تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان کے بعد خاکہ لکھنے والوں میں آغا حیدر حسن، مولوی عبدالحق، چراغ حسن حسرت، بشیر احمد ہاشمی، عبدالرزاق کانپوری، احمد جعفری، وغیرہ شامل ہیں۔ صنفِ خاکہ نگاری کو تابندگی عطا کرنے میں رشید احمد صدیقی کا نام اس لیے نمایاں ہے کہ انھوں نے اپنی ایک عمر اس صنف کی افزائش میں صَرف کی ہے۔آپ کے خاکوں کے مجموعوں میں گنج ہائے گراں مایہ، ہم نفسانِ رفتہ شامل ہیں۔ ذاکر صاحب کے نام سے ان کی ایک کتاب شائع ہوئی ہے جس میں ایک ہی مگر طویل خاکہ ہے۔ اس کے علاؤہ مضامینِ رشید، آشفتہ بیانی میری،اور شیخ نیازی میں آپ کے خاکوں کے نمونے مل سکتے ہیں۔

رشید احمد صدیقی کے بعد اردو خاکہ نگاری نے نئے اسلوبی اور فکری رجحانات اختیار کیےجن میں نفسیاتی گہرائی، ذاتی تجربے اور سماجی شعور کو زیادہ نمایاں حیثیت حاصل ہوئی۔ اس دور میں سعادت حسن منٹو نے خاکہ نگاری کو حقیقت پسندی اور بے لاگ مشاہدے سے جوڑا جب کہ عصمت چغتائی کے ہاں نسائی شعور اور داخلی کرب کی جھلک نمایاں ہے۔ بعد ازاں ممتاز مفتی نے خاکہ نگاری کو ذاتی تجربے، نفسیاتی تجزیے اور فکری مکالمے کی سطح پر پہنچایا۔ اسی تسلسل میں الطاف حسین قریشی اور دیگر معاصر ادیبوں کے ہاں خاکہ نگاری تہذیبی، سماجی اور فکری حوالوں سے جڑتی چلی گئی۔ اس کے علاوہ اہم خاکہ نگاروں میں پروفیسر سلیمان اطہر جاوید ، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، بیگم انیس، مُجتبیٰ حُسین ، صباح الدین عبد الرحمٰن، محمد مثنیٰ رضوی، اے حمید، نصراللہ خان، ماہر القادری، قمر یورش، یوسف بخاری اور انور سدید شامل ہیں۔

بین المتونیت، تعارف و پس منظر:

بین المتونیت ایک مابعد جدید تکنیک ہے۔ جسے پہلی بار جولیا کرسٹیوا نے ۱۹۶۶ ءمیں پیش کیا ہے۔جو فرانسیسی ماہرِ لسانیات ہیں۔ سلیون بلغاریہ میں۲۴جون ۱۹۴۱ ءکو پیدا ہوئی۔ جولیا کرسٹیوا نے یونیورسٹی آف صوفیہ سے لسانیات کی ڈگری حاصل کی۔ اس یونیورسٹی نے جولیا کے افکار و نظریات کو تحریک دی جس کے نتیجے میں اس نے لسانیات میں تحقیق و تنقید کو نصب العین بنا لیا۔جولیا کرسٹیوا کی یہ خوش قسمتی رہی ہے کہ اسے فرانس میں دنیا بھر کے ممتاز ماہرین لسانیات سے اکتسابِ فیض کا موقع فراہم ہوا۔ نیز ٹل کوئیل(فرانسیسی رسالہ) میں اپنے مقالات پیش کرنے کا بھی موقع بھی میسر آیا۔روسی ہیت پسندی، ہیگل اور میخائل باختن کے نظریات و تصورات کا مطالعہ کرتے ہوئے ان کا تجزیے بھی پیش کیے۔

جولیا کرسٹیوا کے تمام تصورات میں بین المتونیت کو خاصی اہمیت حاصل ہے۔جولیا کرسٹیوا کے مطابق کوئی بھی متن خود مختار نہیں ہے۔ ایک متن کو سمجھنے کے لیے لازمی ہے کہ کسی دوسرے متن کے معنی اور سیاق و سباق کو سامنے رکھا جائے ۔ کیونکہ ہرمتن کئی دوسرے متون کی مدد سے وجود میں آتا ہے۔اسی تناظر میں جولیا کرسٹیوا کارنیوالزم(Carnivalsim) کو بین المتونیت کی سب سے واضح اور موثر مثال کے طور پر پیش کرتی ہیں۔ ان کے مطابق کارنیوال کی دنیا ایک ایسی علامتی فضا ہے جہاں مختلف متنوں اور بیانیہ روایات کے درمیان مکالمہ، تصادم اور معنوی تبدیلی کا

) کے باب Desire and Languageعمل تیز ہو جاتا ہے۔اس حوالے سے آپ اپنی کتاب (
) میں بین المتونیت کے حوالے سے کہتی ہیں :Word,Dialouge and Novel(

Texts meet, contradict and relativize each other through repetition, illogical constructions and non-exclusive oppositions.۴

جولیا کرسٹیوا کہتی ہیں کہ متن نہ صرف ایک دوسرے سے ملتے ہیں بلکہ ان کے درمیان مقابلہ، تضاد، نفی، ازسرِنو تعریف اور سیاق کی تبدیلی بھی ہوتی ہے۔ معنی ایک سیدھی لکیر میں نہیں بنتابلکہ مختلف متنوں کے باہمی تعامل کے نتیجے میں نئے معنوی امکانات جنم لیتے ہیں۔ادبی بین المتونیت کے نظریے میں Julia Kristeva نے جس نکتے پر سب سے زیادہ زور دیا ہے وہ یہ ہے کہ کوئی بھی متن اپنے وجود میں کبھی خودبس نہیں ہوتا بلکہ وہ ہمیشہ مختلف سابقہ متنوں، ثقافتی حوالوں، تاریخی شعور اور لسانی تجربات کے درمیان ایک مسلسل تبادلے، مکالمے اور مزاحمت کے ذریعے معنی پیدا کرتا ہے۔اردو ادب میں قدوس جاوید، ناصر عباس نئیر، وہاب اشرفی، گوپی چند نارنگ، قاضی افضال حسین اور الطاف انجم نے بین المتونیت کی تعریف وضع کی ہے۔ ناصر عباس نیر نے اپنی کتاب ما بعد جدیدیت نظری مباحث میں مابعد جدیدیت کی مختلف ادبی اصطلاحات کی وضاحت اور تشریح کی ہے جن میں ایک اصطلاح بین المتونیت بھی ہے۔ بین المتونیت کی اصطلاح کے بارے میں انھوں نے بیان کیا ہے کہ :

بین المتونیت کا زور تین باتوں پر ہے : اول یہ کہ کوئی متن خود اپنے آپ میں قائم اور خود منتفی نہیں، دوم یہ کہ متن میں دوسرے متون کے ٹکرانے سے معانی کی کثرت پیدا ہوتی ہے۔ سوم یہ کہ متن کی طرح قرات اور مصنف بھی بین المتونی حیثیت رکھتے ہیں۔ ۵

بین المتونیت کا دائرہ صرف کتابی یا تحریری متن تک مقید نہیں بلکہ یہ زبان، ثقافت اور سماجی حقائق کے مختلف مظاہر کو بھی شامل کرتی ہے۔ اس نظریے کے مطابق وہ حقائق اور تصورات جنہیں براہِ راست بیان کرنا ممکن نہیں روایتی کہاوتیں، قصے، کہانیاں اور مخصوص اسالیب متن کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں اور معنی پیدا کرنے کے عمل میں حصہ لیتے ہیں۔ یوں بین المتونیت نہ صرف ادبی متون کی فکری اور معنوی گہرائی کو بڑھاتی ہے بلکہ اسے ایک وسیع ثقافتی اور سماجی فریم ورک کے ساتھ جوڑ کر قاری کو متن کے مختلف سطحوں پر ادراک کا موقع فراہم کرتی ہے۔کوئی بھی متن خود کفیل نہیں ہوتا بلکہ متن اپنی تشکیل کے لیے دوسرے متون کا محتاج ہے۔ مصنف کے تخلیق کردہ یہی حوالہ جات جان بوجھ کر، حادثاتی، براہ راست (ایک اقتباس کی طرح) یا بالواسطہ (جیسے ترچھا اشارہ) ہو سکتے ہیں۔جولیا کرسٹیوا کا کہنا ہے:

Kristeva assumes that a text is compiled as an assortment of quotations and is assimilation and a makeover of another. Intertextuality reinstates intersubjectivity. In “The Bounded Text,” Kristeva deals with the process of creating a text outside the already present discourse.۶

اب سوال یہ ابھرتا ہے کہ متن میں شامل دوسری تحریروں کی نوعیت کیا ہے؟ قاری کو کیسے اندازہ ہوگا کہ یہ متن در متن سلسلہ ہے کو غیر دانستہ طور پر متن کا حصہ بن گیا ہے۔ جوناتھن کلر ۷کے مطابق متن کی تفہیم کے لیے تحریر کی پانچ سطحیں ہوتی ہیں۔ پہلی سطح سماجی متن ہے یعنی وہ دنیا جسے ہم حقیقت سمجھتے ہیں۔ دوسری سطح ثقافتی متن کی ہے جو مشترکہ علم، اقدار اور روایات پر مشتمل ہوتی ہے اور سماج سے الگ نہیں کی جا سکتی۔ تیسری سطح میں ادیب کے تخلیقی اصول، ادبی روایات اور تحریری ضابطے شامل ہوتے ہیں جن کے تحت وہ لکھتا ہے۔ چوتھی سطح اس رویّے کی

نمائندگی کرتی ہے جس میں مصنوعی ادبی اصولوں کو فطری اور لازمی سمجھ لیا جاتا ہےاور یہی رویّہ معنی آفرینی کو ممکن بناتا ہے۔ پانچویں سطح ادبی متن کی ہے جو پہلے سے موجود تحریروں سے مکالمہ یا اختلاف کرتے ہوئے نئے معنی تشکیل دیتا ہے۔ یوں ہر نئی تخلیق کسی نہ کسی صورت سابقہ متنوں سے جڑی ہوتی ہے

بین المتونیت کے عناصر:

بین المتونیت کے عناصر سے مراد وہ خصوصیات، عوامل یا اصول ہیں جو کسی متن کو دوسرے متون کے ساتھ جوڑتے ہیں اور ان کے درمیان تعلق کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہ عناصر ادبی تخلیقات میں موجود وہ نشانات، حوالہ جات، یا اثرات ہوتے ہیں جو کسی دوسرے متن، اسلوب یا ادبی روایت سے اخذ کیے گئے ہوں۔ بین المتونیت کا بنیادی اصول یہ ہے کہ کوئی متن تنہا نہیں ہوتا بلکہ یہ ہمیشہ دوسرے متون سے مکالمہ کرتا ہے یا ان سے متاثر ہوتا ہے۔بین المتونیت کا نظریہ اس بات کو بیان کرتا ہے کہ کوئی بھی متن اپنی تشکیل میں دیگر متون، تجربات، خیالات اور حوالوں سے متاثر ہوتا ہے چاہے یہ شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر ہو ۔ درج ذیل نکات کو بین المتونیت کے تناظر میں واضح کیا جا سکتا ہے۔ جولیا کرسٹیوا نے بین المتونیت کی مختلف اقسام بیان کی ہیں جن میں:

(Quotation, Allusion, Echo, Refrence, Parody, Calque, Unconscious Sources, Imitation, Literary Conventions)

ان کے علاوہ اقتباس، تضمین، تحریف، تاثیر، بین السطور روابط ، متنی مواصلت اور حوالہ شامل ہیں۔ نیز حوالوں کی بھی مختلف پر جولیا کرسٹیوا نے بیان کیا ہے۔ کہ متن میں مختلف حوالے کن صورتوں میں پائے جاتے ہیں۔ وہ حوالے ادبی، سیاسی و سماجی، تہذیبی و ثقافتی، مذہبی ، تاریخی اور اساطیری ہو سکتے ہیں۔بین المتونیت کے عناصر اور حوالہ جات کسی بھی متن کو دیگر متون کے ساتھ معنوی تعلق میں لانے کا اہم ذریعہ ہیں، جو ادب کو سماجی، تاریخی، تہذیبی اور فکری سطح پر گہرائی فراہم کرتے ہیں۔ یہ عناصر، جیسے تاریخی، ادبی، مذہبی، ثقافتی، اور سیاسی حوالہ جات، نہ صرف متن کی معنویت کو وسیع کرتے ہیں بلکہ اسے قاری کے لیے زیادہ قابل فہم اور دلچسپ بناتے ہیں۔ تاریخی حوالہ جات ماضی کی بازگشت فراہم کرتے ہیں، ادبی حوالہ متن کو تخلیقی تسلسل میں جوڑتا ہے، مذہبی حوالہ جات متن میں روحانی اور اخلاقی گہرائی پیدا کرتے ہیں، ثقافتی حوالہ جات تہذیبوں کے رنگ نمایاں کرتے ہیں، اور سیاسی حوالہ جات سماجی شعور اور تبدیلی کے امکانات کو ابھارتے ہیں۔ یوں بین المتونیت قاری کو متن کے ساتھ ایک مکالمے میں شریک کرتی ہے، جہاں متن محض الفاظ کا مجموعہ نہیں رہتا بلکہ تاریخ، تہذیب، اور انسانی شعور کا عکس بن جاتا ہے۔

انور سدید کا تعارف:

انور سدید کا اصل نام انوار الدین ہے۔ آپ ۱۹۲۸ء، کو میانوالی میں پیدا ہوئے۔ آپ سول انجینئر کے پیشے سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن اردو ادب میں اہم محقق اور نقاد کے طور پر جانے گئے۔ ان کا ادبی سفر نوجوانی میں افسانوں کی اشاعت سے شروع ہوا اور بعد میں انہوں نے پی ایچ ڈی مقالہ اردو ادب کی تحریکیں تحریر کیا، جو اردو ادب میں ایک نمایاں تحقیقی کارنامہ ہے۔ انور سدید نے تحقیقی اور تنقیدی کام کے علاوہ تخلیقی میدان میں بھی اپنی چھاپ چھوڑی، جن میں نظمیں، افسانے، انشائیے

اور خاکے شامل ہیں۔ ان کی تحریری کاوشیں اردو خاکہ نگاری کی ترقی اور بین المتونیت کی تفہیم میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

انور سدید کا شُمار اُردو ادب کے پائے کے محققین اور ناقدین میں ہوتا ہے۔ آپ کا پی ایچ ڈی کا مقالہ اُردو ادب کی تحریکیں ادب میں بلاشبہ ایک بڑا کارنامہ ہے۔ اس کے علاوہ پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ، اُردو ادب کی مختصر تاریخ، غالب کے نئےخطوط، اُردو افسانے میں دیہات کی پیشکش، اُردو افسانے کی کروٹیں، اُردو ادب میں انشائیہ، اقبال کے کلاسیکی نقوش، دہلی دور نہیں، اُردو افسانہ:عہد بہ عہد، وزیر آغا ایک مطالعہ اور کئی دیگر تحقیقی کاوشیں ادب کا گراں قدر سرمایہ ہیں۔ تحقیق کے ساتھ ساتھ آپ نے تخلیق کے میدان میں بھی اپنی چھاپ چھوڑی اور نظمیں، انشائیے، افسانے اور خاکے بھی تحریر کیے۔ غلام الثقلین نقوی آپ کے بارے میں لکھتے ہیں:

انور سدید نے تنقید لکھی ،تحقیق کاحق ادا کیا۔انشائیہ لکھا ،افسانہ لکھا ،افسانے اور انشائیے پر تحقیق و تنقید کے جوہر دکھائے۔ خاص طور پر انشائیے کے خدو خال واضح کرنے میں انھیں بڑی محنت کر نی پڑی۔ اس پر مستزادان کی کالم نگاری۔ نہ جانے انھیں یکا یک چار ہاتھ کہاں سے مل گئے۔ایک ہاتھ میں ڈھال ،دوسرے میں نیزہ، تیسرے میں تیر کمان اور چوتھے میں شمشیر براں۔ جو تیر مخالفوں کی طرف سے آتا ہے اسے ڈھال پر روکتے ہیں۔۸

انور سدید کے خاکوں کے یکے بعد دیگرے پانچ مجموعے آسمانِ ادب کی زینت بنے۔انور سدید نے خاکہ نگاری کا آغاز ۱۹۸۹ ء میں پہلے خاکوں کے مجموعے محترم چہرے سےکیا ۔ان کے خاکوں کا دوسرا مجموعہ قلم کے لوگ ایک دہائی بعد ۱۹۹۸ ءمیں منظر عام پر آیا۔ان کا تیسرا خاکوں کا مجموعہ بعنوان ادبیانِ رفتہ سن ۲۰۰۵ءمیں شائع ہوا ۔اس مجموعے میں بھی حسبِ سابق انور سدید نے اپنے دور کی اہم علمی اور ادبی شخصیات کے فن کا احاطہ کیا ہے۔ ان کے خاکوں کا چوتھا مجموعہ ۲۰۰۹ ءمیں بعنوان سعید صورتیں منظر عام پر آیا۔ ان کے خاکوں کا پانچواں اور آخری مجموعہ ان کی وفات سے ایک سال قبل ۲۰۱۵ ءمیں الماریوں میں سجے لوگ کے نام سے شائع ہوا۔ آپ کے تحریر کردہ خاکوں میں شخصیت کی ادبی خدمات پر توجہ رکھی گئی ہے۔ آپ کسی بھی شخص کو اس کی تخلیقات کی روشنی میں پرکھتے اور بیان کرتے ہیں۔ آپ نے انہی شخصیات کے خاکے تحریر کیے ہیں جو ادب سے وابستہ ہیں اور ادبی دنیا میں اپنا معتبر حوالہ رکھتے ہیں۔

انور سدید کے خاکے محض شخصی مضامین نہیں بلکہ ا ن میں اس دور کی مکمل ادبی، تاریخی، سیاسی و سماجی صورتحال پائی جاتی ہے۔ المختصر آپ کے خاکوں میں کئی متون کی گونج سنائی دیتی ہے۔اکثر و بیشتر شخصیات ایسی ہیں جن سے ملاقات کا شرف آپ کو نصیب نہ ہوا۔ مگر ا ن کے عمیق مطالعے کی بنا پر آپ ان کی مرقع نگاری کرنے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں۔ اس بیچ انور سدید مختلف اقتباسات اور حوالہ جات سے اس طرح استفادہ کرتے ہیں کہ ا ن کی خاکہ نگاری صرف مرقع نگاری تک مقید نہیں بلکہ ادب میں وقعت اور امتیازی شان حاصل کر لیتی ہےاس طرح ایک متن میں کئی دوسرے متون شامل ہو جاتے ہیں۔اس کے لیے جولیا کرسٹیوا نے بین المتونیت کی اصطلاح متعارف کروائی ہے۔ انور سدید کی خاکہ نگاری نہ تو مکمل تعریفی ہے اور نہ ہی طنزیہ بلکہ آپ توازن برقرار رکھتے ہوئے شائستہ اور محققانہ لب و لہجہ اپناتے ہیں۔ خاکے کی رواں زبان اور بیانیہ اسلوب قاری کو اکتاہٹ کی بجائے غورو فکر کرنے کی طرف مائل کرتی ہے۔ آپ بطور مورخ، نقاد اور ادیب کی حیثیت سے شخصیت کا ایسا خاکہ تحریر کرتے ہیں کہ جو فقط تعارف نہیں بلکہ فکری ، ادبی، تاریخی، سیاسی و سماجی دستاویز بن جاتا ہے۔اس تحقیق میں انور سدید کی خا کوں میں موجود بین المتونیت کے ادبی، تاریخی اور سیاسی و سماجی حوالہ جات کو دیکھا جائے گا۔

انور سدید کے خاکوں میں بین المتونیت :

اردو کی ادبی روایت میں خاکہ نگار اپنے ذاتی مشاہدات و تجربات اور ملاقاتوں کی بنا پر شخصیات کے خاکےتحریر کرتے ہیں اور یہی عناصر ان کے خاکوں میں نمایاں ہوتے ہیں جبکہ انور سدید کے خاکوں میں ذاتی مشاہدات و تجربات کے برعکس شخصیات کی ادبی کاوشوں اور خدمات کو زیر بحث لایا جاتا ہے۔انور سدید نے ایک سو ایک شخصیات کے خاکے تحریر کیے ہیں اور تمام شخصیات ادبی دنیا سے وابستہ رہی ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ انور سدید کے تحریر کردہ خاکوں میں ادبی حوالوں کی باز گشت سنائی دیتی ہے۔ خاکوں کا جائزہ لیتے ہوئےقاری کو اندازہ ہوتا ہے کہ انور سدید نے جن شخصیات کے خاکے تحریر کیے ہیں ان کے فن و فکر اور ادبی خدمات کا گہرائی سے مطالعہ کر رکھا ہے اور ادبی کے ساتھ تاریخی اور سماجی پس منظر پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ شخصیات کے فن کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے اپنی رائے کے اظہار کے ساتھ مختلف ادباء و شعراء کی آراء کو اقتباسات کی صورت میں پیش کیا ہے۔

انور سدید کے خاکوں میں مختلف علمی و ادبی شخصیات کا تذکرہ ، کتب کے نام، اقتباسات ، رسائل و جرائد کی تاریخ،تبصروں اور تنقیدی حوالہ جات کے ذریعے شخصیت کی تصویر کشی کی ہے۔ یہی بین المتونی طرزِ اظہار ان کے خاکوں کو محض تاثراتی نثر کے بجائے ایک تحقیقی، فکری اور ادبی مطالعے میں بدل دیتا ہے۔ اس طرح انور سدید کے خاکے اردو ادب کی روایت کے ساتھ ایک فکری بحث قائم کرتے ہیں۔ جس میں ایک متن دوسرے متن سے رابطے میں رہتا ہے۔اس سے ان کی تحریری جہتیں زیادہ ہمہ گیر اور معنوی طور پر وقیع دکھائی دیتی ہیں۔

آپ شخصیت پر خاکہ لکھتے ہوئے غیر شعوری طور پر رسائل کے نام اور ان کے مدیران کے حوالے دیتے ہوئے تذکرہ کر دیتے ہیں۔ جس سے قاری کو مختلف ادوار میں جاری ہونے والے رسائل و جرائد کی معلومات ہوتی جاتی ہے۔صرف یہی نہیں آپ شخصیت کی پیدائش اور عہدِ شباب تک جاری ہونے والی رسالوں کا تذکرہ نہایت عمدگی سے کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ سید امتیاز علی تاج کا خاکہ تحریر کرتے ہوئے آپ نے یہی انداز اپنایا ہے اور ان کی پیدائش سے لے جوانی تک جاری ہونے والے رسالوں کا صرف تذکرہ نہیں کرتے بلکہ کہیں نہ کہیں تاریخ بھی واضح کرتے ہیں۔ آپ لکھتے ہیں:

وہ پیدا ہوئے تو "تہذیبِ نسواں" قدم جما چکا تھا ۔ لڑکپن میں تھے تو "پھول "کے مضامین نے کہانیاں سننے اور کہانیاں لکھنے کے ذوق کو پروان چڑھایا۔ ۱۸ برس کے ہوئے تو اپنا ادبی ماہنامہ "کہکشاں" جاری کیا ۔کہکشاں کی ادبی خدمات کا دائرہ" مخزن" کی طرح تو وسیع نہیں ہے۔ اس کی اشاعتی عمر صرف ایک سال ۱۱ مہینے تھی تاہم یہ بات نظر انداز نہیں ہو سکتی کہ "کہکشاں" کےادبی صفحات پر اس دور کے نامور لکھنے والوں نے حصہ لیا اور اس کے پہلے پرچے میں مولوی عبدالحلیم شرر ،مولوی خلیل الرحمن ،عبداللہ العمادی، عبدالمجید سالک، سجاد حیدر یلدرم، خواجہ حسن نظامی، راشد الخیری ،منشی پریم چند اور قاضی عبدالغفار کے مضامین اور افسانے شائع ہوئے اور حصہ نظم میں علامہ اقبال حسرت موہانی ،بیدل، شاہ جہاں پوری، یاس عظیم آبادی، تاجور نجیب آبادی اور مانی جائسی کے شریک ہوئے۔۹

اس اقتباس کا مطالعہ کیا جائے تو دیکھا جا سکتا ہے کہ اس میں تین مختلف رسائل تہذیب نسواں ،پھول اور کہکشاں کا ذکر ہے۔ اور صرف ذکر نہیں ہے بلکہ وضاحت بھی دی جا رہی ہے کہ اس دور میں کون سا رسالہ اپنی اوج پر تھا اور کس رسالے کی عمر فقط گیارہ ماہ تھی۔ اس اقتباس میں ہمیں تین

مختلف متون نظر آتے ہیں جو کہ ادبی بین المتونیت کی ایک عمدہ مثال ہیں۔ انور سدید کی یہی خوبی انہیں محض ایک مورخ نہیں بلکہ ایک ایسے ادیب کے طور پر متعارف کرواتی ہے جو ہر متن میں کئی متون کے دروازے کھول دیتا ہےاور یہی وہ مقام ہے جہاں ان کی تحریروں میں بین المتونیت پوری قوت سے سامنے آتی ہے۔

انور سدید کی خاکہ نگاری کا ایک نمایاں وصف یہ ہے کہ وہ محض مرکزی شخصیت تک محدود نہیں رہتے بلکہ اس کے فکری ماحول، خاندانی پس منظر اور ادبی روایت کے دیگر مماثل یا متعلق شخصیات کا حوالہ بھی ساتھ لاتے ہیں جس سے ایک وسیع تر بین المتونی تناظر وجود میں آتا ہے۔ اسی تناظر میں خاکہ نگار ابن ِانشا کا خاکہ لکھتے ہوئے احمد راہی کی گفتگو کرتے ہوئے ان کی خاکہ نگاری پر مفصل تجزیہ کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ لکھتے ہیں کہ احمد راہی رسالہ سویرا کے ایڈیٹر تھے اور ابن ِانشا سے انور سدید کی ملاقات انھی کی وساطت سے ممکن ہوئی۔ اس طرح مرکزی متن (ابن ِانشا کا خاکہ) میں ایک اور علمی و ادبی شخصیت کا حوالہ اس کے کردار اور اسلوب کے اثرات کے ساتھ شامل ہو گیا جو کہ بین المتونی روش کی بہترین مثال ہے۔ اس اقدام سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انورسدید کے خاکے محض سوانحی داستان نہیں بلکہ ایک وسیع ادبی و علمی ماحول کی نمائندگی کرتے ہیں۔

احمد راہی کی یہ تکنیک بالکل فلمی قسم کی تھی ۔ اور وہ گہرے اندھیروں اور تیز روشنیوں کی سکرین پر تصویر اس طرح ابھارتے کہ تصویر کے نقوش بیک نظر سامنے نہ آتے اور تجسس بڑھتا جاتا ۔چنانچہ احمد راہی کی تصویر اگر تجسس کے گراف کو اعتدال سے آسودگی کی منزل پر لے آتی تو اور اس شخصیت سے پیار دو چند ہو جاتا ۔ میرا خیال ہے کہ احمد راحی کے بیشتر خاکوں کی رنگ آرائی شخصیت کے ذاتی رنگ کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی تھی ۔ چنانچہ ان کے خاکے پڑھے تو دلچسپی سے گئے اور ان سے ممدوحین انا کو تسکین بھی ملی لیکن جب بعض شخصیتوں کا کھو کھلا پن سامنے آیا تو ان خاکوں نے ایک شدید قسم کا احساسِ محرومی بھی پیدا کیا۔۱۰

ابنِ انشاء کا خاکہ تحریر کرتے ہوئے انور سدید احمد راہی کی خاکہ نگاری پر تبصرہ کرتے ہیں جس سے ادیبوں کی شخصیت، اخلاقیات، علمی مقام اور ادبی تضادات قاری کے سامنے آتے ہیں۔ انور سدید کے خاکے ایک طرف تو ادیب کی شخصیت اور عظمت کو نمایاں کرتے ہیں تو دوسری طرف زمانے کی سرد مہری، ادبی ماحول اور ہم عصروں کے اثرات کو بھی ظاہر کرتے ہیں۔ انور سدید نے احمد راہی کے حوالہ کو اپنے ابن انشاء کے خاکے میں اس انداز سے شامل کیا کہ قاری کو یہ معلوم ہو کہ ابن انشا کی ادبی شناخت اور ملاقاتیں کس طرح ادبی حلقوں اور رسالہ سویراکے ذریعے ممکن ہوئیں۔ یوں انورسدید نے ایک متن کے اندر متعدد شخصیات، ادبی تعلقات اور فکری اثرات کو مربوط انداز میں پیش کیا جو بین المتونیت کی اعلیٰ مثال ہے۔ یہ واضح کرتا ہے کہ خاکہ نگاری ایک فرد کی داستان سے بڑھ کر اس کے ادبی اور فکری ماحول کی عکاسی کرتی ہے اور انور سدید نے اس تکنیک کو اپنے خاکے میں انتہائی مہارت کے ساتھ استعمال کیا۔

انور سدید کے خاکوں میں سیاسی اور سماجی حالات کی عکاسی براہِ راست نہیں کی جاتی بلکہ وہ یہ منظرنامہ شخصیات کے کردار، عمل، نظریات اور اثرات کے ذریعے پیش کرتے ہیں۔ ہر شخصیت اپنی سوچ، فیصلوں اور ردعمل کے ذریعے اس زمانے کے سیاسی دباؤ، سماجی مسائل اور فکری رجحانات کی عکاسی کرتی ہے۔ سیاسی اور سماجی حوالہ جات میں صرف حالات یا قوانین کی تصویر کشی کافی نہیں ہوتی بلکہ یہ بھی اہم ہوتا ہے کہ ایک شخصیت کس طرح ان حالات کے اثرات سے نبرد آزما ہوتی ہے اور معاشرتی شعور کی تشکیل میں حصہ ڈالتی ہے۔ اسرار زیدی کی صحافتی زندگی اس بات

کی بہترین مثال ہے کیونکہ انہوں نے مارشل لاء کے سخت ماحول میں بھی حق گوئی اور بے باکی کا مظاہرہ کیا اور اپنے قارئین و علمی حلقوں میں سیاسی و سماجی شعور پیدا کیا۔درج ذیل حوالے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حوالہ نہ صرف سیاسی و سماجی حالات کی عکاسی کرتا ہے بلکہ ایک فرد کی شخصیت اور اس کے اثرات کو بھی اجاگر کرتا ہے۔اسرار زیدی کا خاکہ تحریر کرتے ہوئے آپ لکھتے ہیں:

المیہ یہ ہوا کہ ایوب خان کے مارشل لاء کے دور میں اسرار زیدی کی سیاسی تجزیہ نگاری حق گوئی اور حق پرستی حکمرانوں کو پسند نہ آئی اور اخبار خدمت پر پابندی لگا دی گئی۔ لیکن اب بے باک نگاری اسرار زیدی کے صحافتی مزاج کے حصہ بن چکی تھی۔ انہوں نے منٹگمری کو خیر باد کہا اور شہر بے مثال لاہور میں آگئے جہاں انہوں نےاخبار اخبار ”ہلال پاکستان امروز اور اور ہفتہ وار اقدام میں قلمی ترکتازیاں کیں اور پڑھنے والوں کے و حلقے کو متاثر کیا ۔ ۱۹۷۰ء کی دہائی میں انہوں نے عبداللہ ملک ، آئی اے رحمان، اور حمید اختر کے اخسار میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ اس دور میں ہی انہوں نے لندن کے اخبار ایشیا اور برھم کے جرائد "آئینہ" اور "تصویر" کو لاہور میں بیٹھ کر اپنے فیض قلم سے نوازا۔۱۱

یہ اقتباس اسرار زیدی کی سیاسی و سماجی اہمیت کو نمایاں طور پر اجاگر کرتا ہے۔ ایوب خان کے مارشل لاء کے دوران ان کے صحافتی کام پر پابندی لگائی گئی جو حکومت اور آزادی اظہار کے درمیان تنازعے کی نشاندہی کرتی ہے۔ اس کے باوجود اسرار زیدی نے بے باکی کے ساتھ اپنا صحافتی مشن جاری رکھا اور لاہور منتقل ہو کر مختلف اخبارات اور رسائل میں خدمات انجام دیں۔اس اقتباس میں ذکر شدہ اخبارات اور رسائل (ہلال پاکستان، امروز، اقدام، ایشیا، آئینہ، تصویر) ان کے اثرات اور قلمی خدمات کی وسعت کو واضح کرتے ہیں۔ ان کے کام نے نہ صرف سیاسی دباؤ کے ماحول میں قارئین اور علمی حلقوں میں شعور پیدا کیا بلکہ یہ بھی ثابت کیا کہ فرد کی شخصیت اور اقدامات سیاسی و سماجی حالات کو متاثر کرنے میں کس حد تک مؤثر ہو سکتے ہیں۔

انور سدید نے سیف الدین سیف کے خاکہ تحریر کرتے ہوئے سماجی اقدار اور معاشرتی رویّوں کوموضوع بنایا ہے۔ان میں اُس دور کے سیاسی و مذہبی نعرے، طاقت کے مراکز سے وابستگی، اور معاشرتی منافقت جیسے عناصر بطور پس منظر پیش کیے ہیں۔ پیش کردہ اقتباس اسی بین المتونی تناظر کا حصہ ہے۔ جب خاکہ نگار اُن شخصیات کا ذکر کرتے ہیں جو کبھی بھٹو دور میں ‘‘اسلام اور اشتراکیت’’ کی ہم آہنگی کا اعلان کرتے تھے اور بعد ازاں ضیاء الحق کی آمریت کو اسلامی نظام قرار دینے لگےتو دراصل وہ اُس سماجی فضا کی نشاندہی کرتا ہے جس میں سیف الدین سیف نے زندگی گزاری لکھا اور اپنی شناخت قائم کی۔ یہ حوالہ براہ راست سیف کے عہد کے اُس ذہنی اور سماجی مزاج کو سامنے لاتا ہے جہاں مفاداتی وابستگیاں، بدلتے ہوئے نعروں کی قبولیت اور مذہبی پیرہن میں لپٹی سیاسی سوچ ایک عمومی رجحان کی صورت اختیار کر چکی تھی۔

یہ لوگ یحییٰ خان جیسے بد کردار آدمی سے وظائف بٹورتے تھے۔ بھٹو کے دور میں ببانگ دہل کہا گیا کہ اسلام اور اشتراکیت میں بڑی مشابہت ہے۔ روٹی، کپڑا اور مکان کو اسلامی نعرہ قرار دیا اور اب یہی لوگ ضیاء الحق کی آمریت اور مارشل لاء کو اسلامی نظام قرار دیتے اور اسےمیر المومنین بنانے کی فکر میں ہیں ۔۱۲

اس اشارے کے ذریعے یہ پہلو سامنے آتا ہے کہ سیف الدین سیف کی شخصیت اور ان کی تخلیقی سمت اُس ماحول کی دین ہے جس میں مختلف سماجی تضادات کارفرما تھے۔ ایسے کرداروں کا ذکر جو یحییٰ خان جیسے افراد سے وظائف لیتے تھے یا طاقت کے بدلتے مراکز کے مطابق نظریاتی لبادہ تبدیل

کرتے تھے۔ اس سماج کا وہ رخ سامنے لاتا ہے جس کے درمیان ایک ادیب، شاعر اور فلم ساز کے طور پر سیف نے اپنے لیے راستہ بنایا۔ اس طرح یہ حوالہ سیف کی فکری فضا، معاشرتی تجربات اور ان کے عہد کی اقداری کشمکش کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے یہ بین المتونیت کا وہ پہلو ہے جس میں خاکہ نگار خارجی عہد، سماجی رسوم اور معاشرتی تضادات کے حوالے لا کر سیف الدین سیف کی شخصیت کو اُس بڑے پس منظر میں رکھتے ہیں جس سے اُن کی ادبی تشکیل وابستہ ہے۔ یوں یہ اقتباس سماجی اقدار و رسمیات کے زمرے میں آتا ہے کیونکہ یہ اس معاشرتی ماحول کی تصویر پیش کرتا ہے جو سیف کی تخلیقی زندگی کا جزوِ لازم تھا۔

انور سدید کے خاکے محض شخصیات کے تعارف، تجربات یا مشاہدات کا بیان نہیں بلکہ اپنے اندر وسیع تہذیبی، سماجی اور تاریخی پس منظر سمیٹے ہوئے ہیں۔ وہ شخصیت کی تعمیر، اس کے رویوں کی تشکیل اور اس کے فکری سفر کی توضیح کے لیے تاریخ کو بطور ایک فعال تناظرکے استعمال کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کے خاکوں میں تاریخی حوالہ جات نہ صرف معلوماتی اہمیت رکھتے ہیں بلکہ ان کے ذریعے وہ ایک دور کی سیاسی فضا، انتظامی ساخت، معاشرتی تبدیلیوں اور فکری تحریکوں کو بھی اجاگر کرتے ہیں۔ تاریخ ان کے ہاں محض پس منظر نہیں بلکہ ایک ایسا موثر ذریعہ ہے جو شخصیات کی تہذیبی معنویت اور ان کے کردار کی گہرائی کو نمایاں کرتا ہے۔آ پ کے خاکوں میں ادبی تاریخ کو صرف ادبی شخصیات یا ان کی تصانیف کے ذکر تک محدود نہیں رکھا گیا بلکہ شہر، تہذیب، اور ادبی حلقوں کے تاریخی ماحول کو بھی پیش کیا گیاہے۔ وہ کسی بھی دور کے ادبی و علمی مزاج، شہر کی فضا، عوامی زندگی میں ادباء و علماء کی موجودگی کی اہمیت کے حوالے سے منظر نامہ تخلیق کرتے ہیں۔ اس طرح قاری نہ صرف شخصیت بلکہ اُس زمانے کے ادبی اور تہذیبی ماحول سے بھی روشناس ہوتا ہے۔ زیرِ نظر اقتباس میں خواجہ محمد شفیع کا خاکہ تحریر کرتے ہوئے ان کی جائے پیدائش بتاتے ہوئے غیر دانستہ طور پر اس جگہ کی ادبی تاریخ کو بیان کرنے لگتے ہیں۔ یوں ایک متن دوسرے متن میں ضم ہوتا دکھائی دیتا ہے۔زیرِ سطور اقتباس میں آشوبِ دلی کے نتیجے میں غالب کے ردِعمل کے ذریعے اُس دور کے ادبی منظرنامے کی جھلک پیش کی گئی ہے۔انور سدید لکھتے ہیں:

دلی عہد قدیم سے تہذیب و تمدن کا گھوارہ بنی ہوئی تھی ، شاہ جہاں نے اس کے تہذیبی مزاج کو روشن نقوش سے اُبھارا ، اس شہر جمال افروز میں ایسے علما ، فضلا ، ادباء اطبا اور خطاط جمع کیے کہ دلی سنگ وخشت کا شہر نہ رہا، اس کے باطن میں روح بھی داخل ہو گئی ۔ چنانچہ جب یہ دلی غالب کے عہد میں لٹی تو غالب نے کوچہ و بازار کے تباہ ہو جانے کا ماتم کم کیا، ان فاضلانِ کِرام کو زیادہ یاد کیا جن میں کوئی غالب کا دوست تھا ، کوئی ہمدم، کوئی شاگرد اور کوئی ہم سخن اور جب دیکھا کہ اب دلی کے کو چوں سے ان کی آواز نہیں آتی تو غالب جھنجھلا اٹھا اور کہا:ہائے دلی ، وائے دلی ، بھاڑ میں جائے دلی۔ ۱۳

اس اقتباس میں انور سدید نے شہر کی ادبی اور تاریخی اہمیت کو نمایاں کیا ہے جو اُس دور کے علمی و ادبی ماحول کی عکاسی کرتا ہے۔ عہدِ شاہ جہاں میں دلی شہر کو نہ صرف عمارتوں اور فنِ تعمیر کے ذریعے بلکہ ادبی، علمی اور ثقافتی شخصیات کی موجودگی سے بھی روشن کیا گیا ہے۔ اس شہر میں علماء، ادباء، اطبا اور خطاط جمع تھے جن کی موجودگی شہر کے فکری اور ادبی مزاج کو مضبوط کرتی تھی۔غالب کے دور میں شہر کی تباہی اور کوچہ و بازار کے نقصان کے باوجود انور سدید قاری کو یہ باور کراتے ہیں کہ غالب کے لیے شہر کے ادبی اور علمی حلقے زیادہ اہم تھے۔ غالب کی فکری

حساسیت، دوستوں اور شاگردوں کی یاد، اور شہر کے ادبی ماحول کے ساتھ اس کی جذباتی وابستگی، اُس زمانے کے ادبی ماحول کی گہرائی کو ظاہر کرتی ہے۔

ادبی خاکوں میں علاقائی و برصغیر کی تاریخ کا عنصر اس وقت واضح ہوتا ہے جب کسی شخصیت یا واقعے کو کسی خاص علاقے کے تاریخی اور جغرافیائی پس منظر سے جوڑا جائے۔ درج ذیل اقتباس میں سرگودھا کی تاریخ کا وہ حوالہ سامنے آتا ہے جو نہ صرف علاقائی پس منظر رکھتا ہے بلکہ پاکستان کی عسکری اور قومی تاریخ سے بھی جڑا ہوا ہے۔ ایم ایم عالم اور رفیقی شہید جیسی شخصیات کا ذکر متن میں براہِ راست اُن تاریخی متون کی طرف اشارہ کرتا ہے جو ۱۹۶۵ء کی جنگ، قومی دفاع، اور فضائی کارناموں سے متعلق ہیں۔ اس طرح یہ اقتباس علاقائی جغرافیے، قومی واقعات اور عسکری روایات کے باہمی ربط کو ایک ہی بیانیے میں سمیٹ لیتا ہے، اور یوں متن میں تاریخی حوالہ جات کا وہ سلسلہ قائم ہوتا ہے جو بین المتونیت کی بنیاد رکھتا ہے۔

لیکن یہ سب ۱۹۶۵ء سے پہلے کی باتیں ہیں۔ ۱۹۶۵ء میں سرگودھا کا نام پاکستان کی جغرافیائی حدود سے بلند ہو کہ عالمی سطح پر نمایاں ہوا۔ اس کی عظمت، شہرت اور عزت میں ایم ایم عالم اور رفیقی شہید شامل ہوئے یہ دونوں شاہین جو لپکنے، پلٹنے اور پلٹنے کے بعد پھرجھپٹنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے اسی ادارے کے تربیت یافتہ ہیں جس میں ڈاکٹر سہیل بخاری استاد تھے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مبارزت پسندی ان کے مزاج کا حصہ تھی نہ ہوتی تو وہ پی اے ایف کالج میں ملازمت ہر گز نہ کرتے اور لڑائی کا فن سکھانے والوں سے دور رہتے ۔۱۴

یہ حوالہ سرگودھا کی عالمی شناخت، شجاعت کے کردار، اور استادوں کی تربیت کو مختلف تاریخی بیانیوں اور اجتماعی یادداشت سے ملا کر متن میں بین المتنی ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔سرگودھا کے تاریخی مقام اور وہاں کی اہم شخصیات کو دیکھتے ہوئے یہ واضح ہوتا ہے کہ فرد کی تربیت، مزاج اور کردار میں علاقے کی تاریخی شناخت اور ثقافتی اثرات کس حد تک شامل ہوتے ہیں۔ اس اقتبا س میں بتایا گیا ہے کہ ۱۹۶۵ء سے پہلے سرگودھا کی تاریخی اہمیت پس منظر میں موجود تھی، لیکن ۱۹۶۵ء میں یہ شہر پاکستان کی جغرافیائی حدود میں اور عالمی سطح پر نمایاں ہوا۔ اس کی عظمت، شہرت اور عزت میں ایم ایم عالم اور رفیقی شہید کا کردار نمایاں تھا۔

ادبی متن اکثر نہ صرف اپنے ادبی اور ذاتی تجربات کو بیان کرتا ہے بلکہ دیگر متون نیز تاریخی یا عالمی واقعات کے ساتھ ایک متنی تعلق قائم کر تے ہوئے اپنے اثر کو گہرا بھی کرتا ہے۔ بین المتونیت کے تناظر میں اس ربط کو سمجھنا اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ ادبی تخلیق کسی وسیع تاریخی اور سماجی پس منظر میں کیسے معنی پیدا کرتی ہے۔ درج ذیل اقتباس میں مصنف اپنی نئی کتاب زمان ملی کے اثرات بیان کرتے ہیں اور یہ احساس ظاہر کرتے ہیں کہ ان کے ادبی کام نے ان پر ذہنی اور جذباتی دباؤ پیدا کیا جو عالمی سطح کے ایک تاریخی سانحے(نیویارک ٹریڈ سنٹر پر ۹/۱۱کے دھماکے) سے بھی زیادہ خوفناک محسوس ہوا۔ اس طرح قاری کی توجہ گفتگو آہستہ آہستہ اقتباس کی طرف موڑی جاتی ہے تاکہ قاری کو اس ادبی اور تاریخی ربط کی اہمیت سمجھائی جا سکے۔

مجھے اس کی نظموں کی نئی کتاب " زمان ملی تو میں ایک ایسے سانحے سے گزرا جس کے لیے میں ذہنی طور پر تیار نہیں تھا۔ اس کتاب نے جو دھما کہ کیا وہ اس بم دھماکے سے شاید زیادہ خوفناک تھا جو نیو یارک میں ٹریڈ سنٹر میں نائن الیون کو ہوا تھا۔۱۵

اس اقتباس میں خاکہ نگار نے اپنی ذاتی تجربات کو عالمی تاریخی سانحے کے ساتھ جوڑا ہے۔
۹/۱۱کے دھماکے کو ایک علامتی اور حقیقی تاریخی واقعہ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے جس کے ذریعے قاری مصنف کے ادبی سانحے کی شدت اور اثر کو سمجھ سکتا ہے۔ یہ تعلق بین المتونیت کا

ایک عمدہ مظہر ہے کیونکہ ادبی متن نہ صرف اپنے اندرونی اثرات بیان کرتا ہے بلکہ بیرونی تاریخی واقعات کے ساتھ ربط قائم کرتا ہے۔اس طرح سے ادبی تخلیق اور تاریخی حقیقت ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہو کر معنوی اور جذباتی گہرائی پیدا کرتی ہے۔اور قاری کے لیے ادبی اور تاریخی سیاق دونوں یکجا ہو جاتے ہیں۔تاریخی واقعے کے متن کے ساتھ تعلق کی وجہ سے اس کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے۔ انور سدید کے خاکوں کے تناظر میں یہ ظاہر کرتا ہے کہ ادبی متن، ذاتی تجربہ اور تاریخی حوالہ باہم جُڑ کر قاری کے لیے گہرے معنوی اثرات تخلیق کرتے ہیں، اور ادبی تاریخ و تاریخی حقائق کے درمیان ایک مؤثر اور مربوط رابطہ جنم لیتا ہے۔

ماحصل:

انور سدید کے خاکے محض شخصیات کی تصویر کشی نہیں کرتے بلکہ وہ ہر شخصیت کے ذریعے ایک پورے عہد کی فکری، ادبی، سیاسی اور سماجی تصویر بھی پیش کرتے ہیں۔ ان کے خاکے مختلف ادبی ، تاریخی، سیاسی وسماجی حوالہ جات کے ذریعے نہ صرف متن کی ساخت کو مضبوط کرتے ہیں بلکہ قاری کو اس دور کے ادبی رجحانات، فکری ماحول اور تخلیقی فضاء سے بھی مربوط کرتے ہیں۔ یوں انور سدید کے خاکے فرد کی زندگی اور شخصیت کے تذکرے کے ساتھ ساتھ ایک مربوط اور گہرائی سے بھرپور ادبی منظرنامہ بھی پیش کرتے ہیں جو ان کے ادبی بین المتونیت کے عناصر کی عملی اور مؤثر عکاسی کے بہترین نمونہ کے طور پر سامنے آتا ہے۔

انور سدید کے خاکے محض رسائل و جرائد یا علمی و ادبی شخصیات کا فقط تذکرہ نہیں کرتے بلکہ ہر حوالے کا تاریخی و ادبی پس منظر بھی تفصیل کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ قاری کو نہ صرف اس حوالے کی شناخت حاصل ہوتی ہے بلکہ اس کے ادبی اور فکری اثرات، اہمیت اور کردار کا بھی ادراک ہوتا ہے۔ اور اس کے ذریعے اس دور کے ادبی رجحانات، موضوعاتی پس منظر اور تخلیقی ماحول کا بھی شعور حاصل ہوتا ہےجس سے خاکے میں ادبی بین المتونیت کی عملی عکاسی بخوبی سامنے آتی ہے۔انور سدید کا یہ اسلوب قاری کو ادبی حلقوں اور فکری رجحانات سے مربوط کرتا ہے۔ ہر ادبی حوالہ ایک مکمل ادبی منظرنامہ پیش کرتا ہےجس میں شخصیت، متن اور ادبی پس منظر کا باہمی تعلق واضح ہوتا ہے۔ اس اندازِ بیان کے نتیجے میں خاکے نہ صرف معلوماتی حیثیت اختیار کرتے ہیں بلکہ ادبی بین المتونیت کے اصولوں کے مطابق دیگر متون، شخصیات اور تخلیقی رجحانات کے ساتھ گہرے ربط پیدا کرتے ہیں۔یوں قاری کو محض کسی شخصیت یا رسالے سے متعارف کروانے تک محدود نہیں رکھا جاتا بلکہ ایک مربوط ادبی فضا میں لے جایا جاتا ہے۔

انور سدید جس دور کی شخصیت کا خاکہ لکھتے ہیں اس کے ساتھ اس دور کے سیاسی و سماجی رویّوں، طبقاتی حالات اور فکری کشمکش کو بھی اجاگر کرتے ہیں۔ اس طرح انور سدید کے خاکے نہ صرف افراد کی شخصیت کی تصویر کشی کرتے ہیں بلکہ پورے ادبی نظام، فکری رجحانات اور سیاسی و سماجی ماحول کی عکاسی بھی پیش کرتے ہیں۔ انور سدید کے خاکے سیاسی و سماجی شخصیات کی تفصیل، ان کے کردار اور فکری موقف کو واضح کرتے ہیں اور سیاسی تحریکوں کے ذکر کے ساتھ ان کے اثرات پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ اس طرح قاری خاکے پڑھتے ہوئے صرف ایک فرد کی زندگی نہیں دیکھتا بلکہ پورے عہد کا مطالعہ کرتا ہے۔ جس میں ادبی، فکری اور سیاسی و سماجی رجحانات کے باہمی تعلقات سامنے آتے ہیں۔ انور سدید کے خاکوں میں شامل نظریاتی اور

فکری حوالہ جات، سماجی اقدار اور رسمیات قاری کو اس دور کے معاشرتی اور ادبی ماحول کی جامع سمجھ فراہم کرتے ہیں۔
انور سدید چونکہ بنیادی طور پر خود ایک محقق ہیں اسی وجہ سے ان کے خاکوں میں تاریخی حوالے نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ وہ تاریخ کو محض واقعاتی صورت میں پیش نہیں کرتے بلکہ اشارے کے طور پر بھی شامل کرتے ہیں تاکہ قاری کو ادبی اور فکری تناظر کے ساتھ تاریخی شعور حاصل ہو۔ اس کے علاوہ آپ ادب سے وابستہ شخصیات اور رسائل کی تاریخ کو بھی تفصیل سے بیان کرتے ہیں جس سے خاکے تحقیقی دستاویز کی شکل اختیار کرتے ہیں۔ بعض مواقع پر وہ علاقائی تاریخ اور مخصوص جغرافیائی حالات کا ذکر بھی شامل کرتے ہیں۔جو متن کی معنوی گہرائی اور فکری وسعت میں اضافہ کرتا ہے۔ان تمام عناصر کو تحقیق کے دوران تلاش کیا گیا اور تحقیقی مقالے میں وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔
مجموعی طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ انور سدید کے خاکے ادبی، تاریخی، سیاسی اور سماجی حوالہ جات کا ایک مربوط اور بامعنی امتزاج پیش کرتے ہیں۔ ان کے خاکے محض کسی شخصیت یا واقعے کی تصویر کشی تک مقید نہیں بلکہ ہر حوالہ چاہے وہ ادبی ہو، علمی ہو، رسائل و جرائد سے متعلق ہو یا سماجی و سیاسی ماحول سے وابستہ ہو، متن کی ساخت میں ایک منطقی اور معنوی ربط پیدا کرتا ہے۔ ان کے خاکے بین المتونیت کے عملی مظاہر پیش کرتے ہیں اس کی اہم وجہ یہ ہے کہ آپ نے خاکے شخصیات سے ملاقاتوں کی بنا پر نہیں بلکہ اپنے مطالعے اور علمیت کی بنا پر لکھے ہیں۔ کیونکہ آپ کے تحریر کردہ خاکوں کی کم و بیش تمام شخصیات ایسی ہیں جن سے آپ نے ایک دو بار ملاقات کی ہو یا پھر کبھی ملے ہی نہ ہوں۔اسی وجہ سے ان کے خاکوں میں تحقیقی رنگ زیادہ غالب ہے۔ان کے خاکوں میں مختلف متون اور فکری روایتیں اس قدر مربوط ہیں کہ ہر حوالہ اور اقتباس متن کی معنویت اور فکری توازن کو مضبوط کرتا ہے۔اس تحقیق کے نتائج اس امر کی تصدیق کرتے ہیں کہ انور سدید کی خاکہ نگاری اردو نثر میں فکری گہرائی، ادبی وقار اور معنوی وسعت کا ایک نمایاں اور منفرد نمونہ ہے جو نہ صرف قاری کو علمی و ادبی شعور فراہم کرتا ہے بلکہ انہیں ایک مربوط ادبی، تاریخی اور سماجی فضا میں بھی مشغول کرتا ہے۔

حوالہ جات:

۱۔سید محمد حسنین،خاکہ نگاری، نیا دور، جلد نمبر ۱۹ ،شمارہ نمبر ۷(اکتوبر ۱۹۶۴ء) ص ۱۸۔

۲۔ڈاکٹر بشیر سیفی، خاکہ نگاری،فن و تنقید، (لاہور: نذیر سنز پبلشرز،۲۰۱۳ء) ص ۱۳۔

۳۔محمد حسین آزاد ، آبِ حیات، (لاہور: اسلامیہ اسٹیم پریس ،۱۹۷۸ء) ص ۵۔

۴۔ Kristeva, Julia. "*Desire in Language: A Semiotic Approach to Literature and Art*". Edited by Leon S. Roudiez.Translated by Thomas Gora, Alice Jardine, and Leon S. Roudiez. New York: Columbia University Press, 1980 pg 2

۵۔ناصر عبا س نیر، مابعد جدید تنقید(دہلی : ایجوکیشن پبلشنگ ہاوس،۲۰۱۳ء)،ص ۲۱۳۔

۶۔ Elmo Raj, P. "*Text/Texts: Julia Kristeva's Concept of Intertextuality*." Ars Artium: An International Peer Reviewed-cum-Refereed Research Journal of Humanities and Social Sciences 3 (2015): 78

۷۔ گوپی چند نارنگ ،ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز ، ۲۰۱۰ء)، ص ۲۰۷۔۸۔
۸۔انور سدید، الماریوں میں سجے لوگ (اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز ۲۰۱۵)ص۱۷۵۔
۹۔انور سدید ، محترم چہرے (کراچی: نفیس اکیڈمی, ۱۹۸۹)ص۱۵۔
۱۰۔ڈاکٹر انور سدید ، ادبیانِ رفتہ ، ماہنامہ سپوتنک، جلد سولہ، شمارہ نمبر ۱۱ (نومبر ۲۰۰۵)ص ۱۴۔
۱۱۔انور سدید، الماریوں میں سجے لوگ (اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز ۲۰۱۵ء)ص۱۳۔
۱۲۔ڈاکٹر انور سدید ، ادبیانِ رفتہ، ماہنامہ سپوتنک، جلد سولہ، شمارہ نمبر ۱۱ (نومبر ۲۰۰۵ء)ص۸۲۔
۱۳۔ڈاکٹر انور سدید ، سعید صورتیں (اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز ، ۲۰۰۹ء)ص۳۹۔
۱۴۔ڈاکٹر انور سدید، قلم کے لوگ (لاہور: مکتبہ فکر و خیال ۱۹۹۸ء)ص۶۳۔
۱۵۔انور سدید، الماریوں میں سجے لوگ (اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز ۲۰۱۵ء)ص۴۰۔